© rasailojaraid.com

گزشتہ سے پیوستہ

قسط نمبر ۲

تعلیم و تعلّم

ڈاکٹر سعید حسن

اجرتِ تعلیم

تعلیم کی اجرت کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ امام ابو حنیفہ، امام احمد بن حنبل، امام سفیان ثوری قرآن و حدیث کے پڑھانے کی اجرت کو ناجائز خیال کرتے ہیں، امام غزالی کا بھی یہی خیال ہے کہ علم سکھانے کی نہ مزدوری طلب کی جائے اور نہ کسی عوض کی امید رکھی جائے بلکہ اظہارِ شکر کو بھی وہ پسند نہ کرتے تھے۔ بعض علماء اجرت لینے کو جائز خیال کرتے ہیں۔ لیکن قابلِ قدر وہی عالم سمجھا جاتا تھا جو صرف خدا کے واسطے قرآن و حدیث کی تعلیم دے، اسی لیے جو عالم درس دیتے تھے وہ حصولِ معاش کے لیے عموماً دوسرا کام بھی کرتے تھے یا سیکھتے تھے، ایسے علماء کی مثالیں بھی موجود ہیں جنھوں نے اپنی ساری پونجی طلبہ کی امداد میں صرف کردی اور خود عسرت کے ساتھ زندگی بسر کی۔ امام محمد ابن الحسن کافی مالدار تھے انھوں نے اپنا تمام مال تحصیل علم اور طلبہ کی امداد پر خرچ کردیا، یہاں تک کہ آپ کے پاس اچھے کپڑے تک نہ رہے۔ ایک مرتبہ امام ابو یوسف نے ان کے پھٹے کپڑے دیکھ کر ان کے لیے نہایت عمدہ کپڑے بھیجے لیکن آپ نے ان کا ہدیہ قبول کرنے سے انکار کردیا، آپ نے اس کو ذلت کا باعث خیال کیا اور حدیث: "لَیْسَ لِلْمُومِنِ اَنْ یذلل نَفْسَہ" "یعنی مؤمن اپنے نفس کو ذلیل نہ کرے" پر عمل کیا اور امام ابو یوسف کو لکھ دیا "اَعْجَلَ لَکُمْ واجّل لنا" (یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں تم کو اسی دنیا میں دیدی ہیں اور ہمیں آخرت میں عطا فرمائے گا) اسی طرح فخر الاسلام الاسایندی کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ تنہائی میں خربوزہ کا چھلکا کھا رہے تھے، ایک لونڈی نے دیکھا اور اپنے مالک سے یہ قصہ بیان کیا، اس لونڈی کے مالک نے آپ کو دعوت دی لیکن آپ نے دعوت قبول نہیں کی۔

انھیں علماء میں سے جو حصول معاش کے لیے دوسرے پیشے اختیار کرلیتے تھے بعض ایسے صاحب کمال پیدا ہوئے جو اپنے وقت کے امام خیال کیے جاتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ بزاز تھے، شمس الائمہ حلوائی تھے، امام ابو جعفر کفن دوز تھے، مروزی قفل سازی کرتے تھے اور آج بھی انھیں پیشوں کے انتساب کے ساتھ ان کا نام لیا جاتا ہے۔

گیارھویں صدی تک علماء خود ذرائع معاش تلاش کرتے تھے چنانچہ جو لوگ خدمتِ علم کرتے تھے یا تو مال دار ہوتے تھے یا قاضی یا مفتی وغیرہ کے کسی عہدہ پر مامور ہوتے تھے لیکن محتاط علماء، عہدے کو قبول کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ امام ابو حنیفہ نے قید خانہ کے مصائب برداشت کیے لیکن بغداد کے عہدۂ قضا کو کسی طرح قبول کرنا پسند نہیں کیا، جب ان سے بہت اصرار کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ "میں اس منصب کا مستحق نہیں ہوں" جب اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے کہا کہ "جو میں کہتا ہوں اگر سچ ہے تو یہ عہدہ مجھے نہ ملنا چاہیے اور اگر میرا بیان غلط ہے تو جھوٹے کو قاضی بنانا کہاں تک مناسب ہے" اس قسم کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ چنانچہ علامہ نووی نے تیرھویں صدی عیسوی میں پڑھانے کی تنخواہ لینے سے انکار کردیا۔ مشہور عالم صبغی (۳۸۵ھ۔۹۹۵ء) رنگ بیچتا تھا اور اس کی دکان پر اس زمانے کے جملہ محدثین جمع ہوتے تھے، اس نے اپنے گھر کو جس کا نام "دار السنّت" تھا، تعلیم کے لیے وقف کردیا اور اس کے اخراجات کے لیے اوقاف مقرر کیے، اسی طرح دلغ جو بہت بڑا عالم گزرا ہے نہایت کامیاب سوداگر تھا، اس نے اپنی وفات کے وقت تین لاکھ دینار چھوڑے اس نے اپنی کتابوں کا نہایت عمدہ مجموعہ اپنے ایک ہم عصر کو دے دیا۔ علامہ سبکی نے قاہرہ کے ایک عالم کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خیاطی سے اپنی روزی کماتا تھا اور کسی کے

© rasailojaraid.com

گھر کا پانی پینا تک پسند نہ کرتا تھا، مطرز (۳۴۵ھ۔۹۵۶ء) جو اپنے زمانے کا زبردست ماہر لسانیات تھا، اس کے متعلق مشہور ہے کہ اس کی عمر ہمیشہ تکالیف میں گزری کیونکہ یہ تحصیل علم میں اس قدر مشغول تھا کہ اس کو دوسرا کام کرنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ یحییٰ ابن عدی خطاطی کرتا تھا۔ دسویں صدی کے ایک مشہور فلسفی نے طبری کی تفسیر قرآن کی دو مرتبہ کتابت کی، اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ چوبیس گھنٹے میں سو صفحے لکھتا تھا، ابوہاشم باشندۂ نیشاپور نے پچاس سال تک کتابت کا پیشہ کیا، دقاق (۳۸۶ھ۔۹۹۶ء) جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے ایک سال میں صحیح بخاری کی نقل کی تھی، خطاطی کے ذریعہ اپنی ماں، بیوی اور لڑکی کی پرورش کرتا تھا۔ جوزقی (۳۸۸ھ۔۹۹۸ء) کا بیان ہے کہ اس نے دس لاکھ درہم تحصیل علم میں صرف کیے لیکن اس علم سے ایک درہم بھی نہیں کمایا۔ ایک شخص نے مشہور خطیب کی جانماز کے نیچے چپکے سے تین سو درہم رکھ دیئے، خطیب کو جب معلوم ہوا تو اس نے غصہ میں جانماز زور سے جھاڑی اور مسجد سے ہمیشہ کے لیے چلا گیا، یہ درہم بعد میں لوگوں نے چن کر اٹھا لیے۔

تعلیم کے لیے سیاحت

قبل ظہور اسلام عرب میں تجارت وغیرہ کی غرض سے سیاحی کا عام رواج تھا، بعد ظہور اسلام مذہب نے بھی سیاحت کی ترغیب دی چنانچہ حج کرنے کی ہدایت پہلی ترغیب سفر خیال کی جاتی ہے۔

مکہ میں علماء دور دراز مقامات سے آتے تھے اور بغداد (جو اس زمانہ میں مرکز علم تھا) دیکھنے ضرور جاتے تھے اور دمشق وغیرہ کے علماء کے درس سے بھی مستفید ہوتے تھے اس طرح مصر تک سفر کرتے تھے، یہی حالت ان لوگوں کی تھی جو افریقہ اور مغرب بعید سے آتے تھے۔ اقوال وافعال رسول اللہ جو خاص مذہبی اہمیت رکھتے تھے ان کے متعلق صحیح اطلاعات معلوم کرنا مذہبی فرض سمجھا جاتا تھا۔

بہت سی حدیثیں لوگوں نے اپنے مقصد کے مطابق اختراع کر لی تھیں، جن کی تصحیح کے لیے متعدد راسخ الایمان علما نے ان مقامات تک نہایت تکلیف دہ سفر اختیار کیے جہاں ان کو امید ہوتی تھی کہ ان کو صحیح حدیث کا پتہ چل سکتا ہے، ان لوگوں کے سفروں کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ احادیث جمع کرنے کے لیے یہ سفر کی کتنی مشکلات برداشت کرتے تھے، مشہور امام بخاری اپنا وطن ترکستان چھوڑ کر محض بغداد ہی نہیں آئے، جو ان کے زمانے میں زبردست علمی مرکز تھا بلکہ وسط عرب، شام و مصر کا بھی سفر کیا اور سولہ برس تک سیاحی کے بعد ساٹھ ہزار احادیث جمع کیں، اسی طرح ابوالقاسم نے سفر کر کے تیرہ ہزار حدیثیں سنیں جن میں وہ احادیث بھی شامل ہیں جن کو انھوں نے اسّی عورتوں سے سنا تھا۔

مکحول نامی ایک مصری غلام نے مال غنیمت کی تقسیم کے متعلق رسول اللہ کی صحیح حدیث معلوم کرنے کے لیے تمام عراق، حجاز و شام کا سفر کیا اور آخر کار زیاد ابن جاریہ سے ایک حدیث حاصل کی جس کے راوی حسیب ابن القہر تھے۔ علامہ نووی وذہبی وغیرہ نے اپنی تصانیف میں اس قسم کے سفروں کا تذکرہ کیا ہے، احادیث کے علاوہ دیگر علوم کے لیے بھی لوگ سفر اختیار کرتے تھے۔

چونکہ علوم کی تعلیم عموماً زبانی ہوتی تھی یا اساتذہ نوٹ لکھوا دیتے تھے اس لیے شائقین خود مصنف کی زبان سے درس سننا ضروری سمجھتے تھے، مقری نے اپنی کتاب ''تاریخ اندلس'' میں ایسے علماء وطلبہ کی ایک طویل فہرست دی ہے جنھوں نے دور دراز سفر کے خطرات و تکالیف کا مقابلہ کر کے تعلیم حاصل کی۔

لسانیات کی تحقیق کے لیے بھی سفر کرنا مذہب ہی سے تعلق رکھتا تھا کیونکہ قرآن کی زبان وسط عرب کی ٹکسالی زبان خیال کی گئی ہے اور قدیم ماہر لسانیات بے حد کوشش کرتے تھے کہ بدویوں کا تقرب حاصل کر کے ان کے محاورات معلوم کریں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے لڑکے یزید کو شاعری اور زبان میں کمال حاصل کرنے کے لیے بدوؤں میں رکھا، لوگوں کو ان کی زبان سیکھنے کا اس قدر شوق تھا کہ بدوان کو اگر سفر میں قید کر لیتے تو اس اسیری کو بھی اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے غنیمت سمجھتے تھے،

© rasailojaraid.com

چنانچہ مشہور ماہر لسانیات ازہری کو جب بدوؤں نے اس کا قافلہ لوٹ کر اسیر کیا تو وہ اس اسیری سے بہت خوش تھا۔

پندرہ برس کی عمر میں لوگ عموماً علوم ضروریہ میں دسترس حاصل کر لیتے تھے اور دوسرے شہروں کے مشہور علماء کے درس میں شامل ہونے کے لیے سفر کرتے تھے، چونکہ جملہ ممالک میں درس عربی زبان میں ہوتا تھا اس لیے ان کو کسی مختلف شہروں کی مساجد میں سمجھنے اور سمجھانے میں دقت نہیں ہوتی تھی، اس زمانہ میں چونکہ خیالات نشر کرنے کے لیے اخبار ورسائل نہیں تھے اس لیے یہ سیاح مختلف ممالک کے علماء کی خبریں بھی لوگوں کو سناتے تھے۔

علماء کی تکریم و تعظیم

ابتدائی تعلیم دینے والے مؤدب یا معلّم کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ الجاحظ نے بیان کیا ہے کہ بعض اوقات مؤدبین کو بجائے نقد کے اجناس میں اجرت دی جاتی تھی اور مختلف قسم کے ذخائر کے لحاظ سے مؤدب کا باورچی خانہ ضرب المثل تھا۔

مشرق کے علاوہ دیگر ممالک اسلامی میں ابتدائی تعلیم دینے والے معلمین کی کافی وقعت تھی، چنانچہ ابن الحوقل اہل صقلیہ کے متعلق طنزاً بیان کرتا ہے کہ صقلیہ کے لوگ پیاز زیادہ کھانے کی وجہ سے احمق ہوتے ہیں اور چیزوں کو ان کی اصلیت کے مطابق نہیں دیکھتے، ان کی حماقت کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ وہ معلموں کو جن کی تعداد تقریباً تین سو ہے کافی اہمیت دیتے ہیں، ان کو اپنا مشیر کار بناتے ہیں اور ان ہی میں سے اپنی عدالتوں کے لیے اسیسر مقرر کرتے ہیں حالانکہ لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ معلموں کی عقل کتنی محدود ہوتی ہے اور ایسے لوگ یہ پیشہ محض بزدلی اور اکتساب روزی کی جدوجہد سے بچنے کے لیے کرتے ہیں، مشرق میں مالداروں کے گھروں پر جو استاد تعلیم دیتے تھے ان کی حالت معلمین سے بہتر تھی، عبداللہ ابن طاہر کے بچوں کو پڑھانے کے لیے جو معلم مقرر کیا گیا تھا اس کو ستر درہم مشاہرہ دیا جاتا تھا، اس معلم کے کام کی دیکھ بھال اُس کا استاد کرتا تھا چنانچہ یہ استاد معلم کے شاگردوں کا امتحان لیتا تھا اور اس کو اختیار تھا کہ اگر وہ اس کے کام سے مطمئن نہ ہو تو اس کو برطرف کر دے، اس قسم کی ملازمت عموماً ماہر لسانیات کو ملتی تھی، محمد ابن عبداللہ ابن طاہر جو اپنے زمانے کا بڑا فیاض شخص تھا اُس نے مشہور نحوی ثعالب کو اپنے بچوں کو پڑھانے کے لیے مقرر کیا تو استاد و شاگرد کے رہنے کے لیے ایک علاحدہ مکان دیا اور روزانہ سات آدمیوں کے لیے خوراک مقرر کی جس میں علاوہ دیگر اجناس کے تین سیر گوشت بھی شامل تھا، اس مقررہ خوراک کے علاوہ ان کے گھوڑوں کا چارہ بھی محمد بن عبداللہ کی طرف سے ملتا تھا، مذکورہ بالا خوراک کے علاوہ ایک ہزار درہم تنخواہ بھی دی جاتی تھی۔

مالدار لوگ بڑی دھوم دھام سے اپنی اولاد کی تعلیم شروع کرنے کی رسم ادا کرتے تھے چنانچہ بغداد کے ایک وزیر نے اپنے بچے کی تعلیم شروع کرتے وقت تین سو آدمیوں کی دعوت کی جس میں مختلف عہدوں کے لوگ شریک تھے اور معلم کو ایک ہزار دینار بطور عطیہ پیش کیے، شہزادوں کے ساتھ ان کے ملازم بھی مدرسہ جاتے تھے، چنانچہ مامون کے ساتھ ایک غلام رہتا تھا جو مامون سے تختی لے کر دھو سکھا کر لکھنے کے لیے دیتا تھا۔

جاحظ جو ہمیشہ پھبتی اڑانے کے عادی تھے ان کے بیان کے برخلاف متعدد کتابوں میں تعلیم دینے والوں کی تعظیم و تکریم کی ہدایات ملتی ہیں اور تاریخی واقعات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ علماء اور اعلیٰ تعلیم دینے والوں کی خلفاء اور امراء اور طلبہ میں خاص وقعت تھی، زرنوجی اہل علم اور علم کی تعظیم کے باب میں لکھتا ہے کہ ''اگر طالب علم اہل علم کی تعظیم نہیں کرتا تو نہ اس کو علم حاصل ہو سکتا ہے اور نہ علم سے نفع اٹھا سکتا ہے'' اس کا خیال ہے کہ جس کسی کو علم حاصل ہوا ہے وہ علم کے احترام کی وجہ سے اور جو کوئی علم سے بے بہرہ رہا ہے وہ ہمیشہ ترک احترام کی وجہ سے، جو علم کی تعظیم کرتا ہے وہی معلم کی تعظیم کر سکتا ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مقولہ ہے کہ ''جس نے مجھ کو ایک لفظ بھی سکھایا، میں اس کا غلام ہوں'' تعلیم کی توقیر کی بابت علامہ زرنوجی تحریر کرتے ہیں کہ:

''طالب علم معلم کے آگے نہ بیٹھے اور نہ اس کے قریب بیٹھے کیونکہ استاد کے بالکل قریب بیٹھنا بھی

© rasailojaraid.com

بے ادبی ہے، استاد اور شاگرد میں ایک قوس کا فرق ہونا چاہیے، شاگرد، استاد کی نشست گاہ پر کبھی نہ بیٹھے اور بے موقع سوال نہ کرے، نہ بلا اجازت بات کرے، اس کے دروازے پر دستک نہ دے، اس کے نکلنے کا انتظار کرے اور اس کے غصہ سے اجتناب کرے۔"

قاضی امام فخر الدین الارسابندی جو مرو کے مشہور رئیس الائمہ تھے اور جن کی سلطان نہایت عزت کرتا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ:

"مجھ کو یہ منصب اپنے استاد امام زید الدبوسی کے احترام کے طفیل میں ملا، میں ان کی خدمت کرتا تھا ان کا کھانا پکاتا تھا اور اس میں خود سے کبھی نہیں کھاتا تھا۔"

شمس الائمہ حلوائی ایک مرتبہ کسی حادثہ کی وجہ سے بخارا سے تشریف لے گئے اور ایک قریہ میں مقام کیا، وہاں ان کے جملہ تلامذہ سوا قاضی ابوبکر الزرنجری کے ان سے ملنے آئے۔ جب قاضی مذکور سے کچھ عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی تو شمس الائمہ حلوائی نے ان سے نہ ملنے کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ "میں اپنی والدہ کی خدمت میں مشغول تھا" حلوائی نے فرمایا کہ "دنیا میں رزق تو کافی ملے گا لیکن تمھارے درس میں کبھی رونق و زینت نہ ہوگی" چنانچہ یہی ہوا کہ ان کے درس میں لوگ بہت کم شریک ہوتے تھے۔

استاد کی تعظیم، جس سے استاد ناراض ہوتا ہے اس کو یا تو علم بالکل نصیب نہ ہوگا یا بہت کم نصیب ہوگا:

ان المعلم والطبیب کلاھما لاینصحان اذا لم یکرما

فاصبرلدائك ان جفوت طبیباً واقنع بجھلك ان جفوت مُعلما

(اگر معلم اور طبیب دونوں کی عزت نہ کی جائے گی تو وہ صحیح نصیحت نہیں دیں گے۔ اپنے مرض پر صبر کر اگر طبیب کو ناراض کرتا ہے، اپنی جہالت پر قناعت کر اگر معلم کو ناراض کرتا ہے۔)

زرنوجی ایک حکایت بیان کرتا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید نے اپنے بیٹے کو اصمعی کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا کہ وہ اس کو علم و ادب سکھائے۔ خلیفہ نے ایک دن دیکھا کہ اصمعی وضو کر رہا تھا اور بیٹا اس کے پاؤں پر پانی ڈال رہا تھا، خلیفہ اصمعی پر بہت ناراض ہوا کہ میں نے تیرے پاس ادب و تعلیم کے لیے بھیجا تھا تو نے اس کو یہ حکم کیوں نہیں دیا کہ ایک ہاتھ سے پانی ڈالے اور دوسرے ہاتھ سے تیرا پاؤں دھوئے۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ امین و مامون کے متعلق مشہور ہے کہ ان دونوں میں ایک مرتبہ صرف اس بات پر جھگڑا ہوا کہ ان دونوں میں سے کون اپنے استاد فراء کی جوتیاں اٹھا کر اس کے سامنے رکھے، دونوں اس امر میں مسابقت کرنا چاہتے تھے، بالآخر یہ طے پایا کہ ہر ایک، ایک ایک جوتی اٹھا کر اس کے سامنے رکھے، جب خلیفہ ہارون الرشید کو اس واقعہ کی خبر پہنچی تو اس نے فراء سے پوچھا کہ آج دنیا میں سب سے بڑی شان کس کی ہے، فراء نے جواب دیا کہ خلیفہ المسلمین کی، خلیفہ نے کہا کہ نہیں بلکہ اس کی جس کی جوتیاں خلیفہ کے دو نور العین اُٹھائیں، فراء نے کہا میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ ان کو اس سعادت سے محروم رکھوں، خلیفہ نے کہا آپ ان کو اگر منع کرتے تو مجھے رنج پہنچتا۔

زرنوجی کا خیال ہے کہ تملق (چاپلوسی) ہر جگہ مذموم ہے مگر استاد کے ساتھ تملق جائز ہے تاکہ استاد سے کلی استفادہ ہو سکے، اس کا خیال ہے کہ طالب علم کو چاہیے تحصیل علم میں استاد کی ہدایت پر عمل کرے کیونکہ استاد بہتر جانتا ہے کہ کس قسم کی تعلیم مناسب ہوگی۔

شیخ الاسلام برہان الحق والدین فرمایا کرتے تھے کہ پہلے شاگرد استاد کی ہدایت کے موافق تعلیم حاصل کرتے تھے اور اپنے مقصد و مراد کو پہنچتے تھے، اب استاد کی ہدایات کو نہیں مانتے اور اسی لیے علم بھی طلبہ کو اس درجہ کا حاصل نہیں ہوتا جتنا کہ پہلے ہوتا تھا، اسی ضمن میں شیخ الاسلام نے یہ حکایت بیان کی کہ محمد بن اسمٰعیل بخاری کتاب الصلاۃ علی محمد بن الحسن سے پڑھتے تھے ایک مرتبہ علی محمد بن حسن نے ان سے کہا کہ تم اس کتاب کو چھوڑ کر حدیث پڑھو، حدیث میں زیادہ اچھے رہو گے، چنانچہ امام بخاری نے ان کی ہدایت کے موافق حدیث پڑھنا شروع کی اور محدثین کے امام کہلائے جانے لگے، امام غزالی کا بھی یہی خیال ہے کہ طالب علم کو استاد پر حکومت نہ کرنا چاہیے بلکہ اپنے ہر معاملہ

© rasailojaraid.com

کو اس کے حال پر چھوڑ دے اور اس کی رائے کو ایسا مانے جیسا بیمار، طبیب حاذق کی رائے کو مانتا ہے۔

تواریخ و سیر سے پتہ چلتا ہے کہ علماء بڑے پایہ کے لوگ ہوتے تھے اور خلفاء و عوام ان کی بڑی عزت کرتے تھے، علماء بھی اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے کہ خلفاء اور حکام کو جور و تعدی سے باز رکھیں اور گاہے بہ گاہے خلفاء و علماء کو اس قسم کی نصیحت کرتے رہتے تھے خلق اللہ کے لیے مفید ہو، اگر سلطنت کی کوئی بد عنوانی دیکھتے تھے تو نہایت نڈر ہو کر اس کے خلاف اپنی صدا بلند کرتے اور ایسا کرنے میں ہر قسم کی تکالیف کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتے یہاں تک کہ بعض کو جان بھی دینی پڑی، امام غزالی علماء کے فساد کو سلطنت کے فساد کا باعث خیال کرتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"فساد الرعايا بفساد الملوك وفساد الملوك بفساد العلماء وفساد العلماء باستيلاء حُبّ المال والجاه" (یعنی فساد رعایا فساد بادشاہ سے اور فساد بادشاہ علما کے فساد سے ہوتا ہے اور علما کی خرابی مال اور جاہ کی محبت کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔)

علماء بھی اپنے کو بہت لیے دیئے رہتے تھے اور کسی حالت میں اپنی تذلیل نفس کے لیے تیار نہ تھے، ابو موسیٰ اشعری خطبہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام لے کر دعا کیا کرتے تھے حنتة نے ایک مرتبہ دوران خطبہ میں سوال کیا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا نام کیوں نہیں شامل کرتے، کیا حضرت عمر کو حضرت ابو بکر پر فضیلت حاصل ہے۔ حضرت ابو موسیٰ نے یہ واقعہ حضرت عمر سے کہا۔ حضرت عمر نے حنتة کو بلا کر اس کے متعلق دریافت کیا تو حنتة نے جیسا کہ واقعہ تھا، صحیح صحیح بیان کر دیا۔ حضرت عمر رونے لگے اور فرمایا کہ اس میں میری غلطی ہے کہ میں نے ایسا ہونے دیا، معاف کرو۔

حجاج ابن یوسف کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن اس نے حطیط زیات کو بلا کر سوال کیا کہ تمھارا میرے متعلق کیا خیال ہے اُنھوں نے جواب دیا کہ میں تجھ کو خدا کا دشمن خیال کرتا ہوں، پھر حجاج نے سوال کیا کہ امیر المومنین عبد الملک کے متعلق کیا خیال ہے، حطیط زیات نے کہا کہ خدا کا اصل دشمن تو وہی ہے تو اس کی فرع ہے، حجاج نے ان کو قتل کرا دیا لیکن انھوں نے اس کی مطلق پروا نہیں کی۔

سلیمان بن عبد الملک کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ مدینہ گیا تو اس نے ابو حازم کو طلب کیا اور دوران گفتگو ان سے دریافت کیا کہ ہم لوگ موت سے کیوں ڈرتے ہیں، آپ نے جواب دیا تمھاری دنیا آباد اور آخرت برباد ہے اس لیے آبادی سے بربادی کی طرف جانے سے ڈرتے ہو۔

بنو امیہ کے خاندان کے خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے ایک مرتبہ حضرت حسن بصری سے امام عادل کے صفات دریافت کیے تو انھوں نے ان کو بہت مفصل جواب دیا جس کو وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتے تھے۔

خلفاء بنو عباس، منصور وغیرہ تقویٰ کے لیے زیادہ مشہور نہ تھے پھر بھی فقہاء محدثین و علما کی بڑی قدر کرتے تھے، ایک مرتبہ عمرو ابن عبید مہدی کے ولی عہدی کی بیعت کے بعد منصور کے پاس آیا، منصور نے مہدی کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ ابن امیر المومنین ولی عہد مسلمین ہیں، عمرو بن عبید نے جواب دیا "ہاں معلوم ہے تو نے سارے وہ امور جن کی تجھ سے قیامت کے دن باز پرس ہو گی اس کے سپرد کر دیے ہیں۔" منصور کو اس جواب سے بڑی عبرت ہوئی۔

منصور کے متعلق ایک روایت ہے کہ ایک رات وہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا، اس نے سنا کہ ایک عابد، خدا سے ملک میں بغاوت و فساد کی شکایت کر رہا ہے، منصور نے اس کے قریب جا کر دریافت کیا کہ "آپ کا اس شکایت سے کیا مطلب ہے" عابد نے جواب دیا کہ "میں خدا سے تیری حکومت کی شکایت کر رہا ہوں۔" اور نہایت سختی سے منصور کو لعنت ملامت کی، منصور نہایت خاموشی سے اس کی باتوں کو سنتا رہا۔

منصور اور سفیان ثوری کا بھی قصہ مشہور ہے کہ منصور نے ایک دفعہ سفیان ثوری کو مکہ میں طلب کیا اور کہا "تم مجھ سے کچھ طلب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرو" سفیان ثوری نے جواب دیا کہ "تم انصار و مہاجرین کی تلواروں کی بدولت اس رتبہ کو پہنچے ہو اور آج تمھارے زمانے میں ان کی اولاد بھیک مانگ رہی ہے۔" منصور نے سوال کیا کہ "کچھ طلب کرو" تو آپ نے جواب دیا کہ "حضرت عمرؓ حج میں دس درہم خرچ کیا کرتے تھے اور تو آج اس قدر روپیہ لیے پھرتا ہے کہ بار برداری کے اونٹ بھی اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

علماء کے احترام کا یہ حال تھا کہ ہارون رشید، ابو معاویہ العزیہ کا ہاتھ خود دھلاتا تھا۔ یہ احترام صرف فقہا اور محدثین تک محدود نہ تھا بلکہ علماء نحو و لغت کی بھی کافی عزت ہوتی تھی، ہارون رشید، کسائی اور محمد بن الحسن کو اپنے سامنے کرسیوں پر بٹھاتا تھا اور ان کے لیے حکم تھا کہ خلیفہ کی تعظیم کے لیے کرسیوں پر سے نہ اُٹھیں جب ان دونوں کا اتفاق سے رےؔ میں ایک ہی دن انتقال ہوا تو ہارون کو بے حد افسوس ہوا اور کہنے لگا کہ "آج فقہ اور علم عربی دونوں رےؔ میں دفن ہوگئے۔"

نظام الملک اور ابو اسحاق شیرازی کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ جب نظام الملک نے اپنے نیک اعمال کا محضر لکھوایا اور اس پر اکابر علماء کے دستخط کرانے کا خیال کیا تو اس محضر پر ابو اسحاق شیرازی نے لکھا "احسن الظلمہ حسن" (حسن ظالموں میں غنیمت ہے) ابو اسحاق شیرازی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب وہ خلیفہ کی طرف سے سفیر بنا کر نیشاپور بھیجے گئے تو لوگ دوکانیں بند کر کے راستے میں ان کا استقبال کرتے تھے اور نیشاپور میں امام الحرمین ان کا غاشیہ اپنے کندھے پر رکھ کر نوکروں کی طرح ان کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔

عوام اور طلبہ بھی علماء کی قدر و منزلت میں کمی نہیں کرتے تھے چنانچہ آٹھویں صدی میں ایسے واقعات کا پتہ چلتا ہے کہ محتاج اور بیمار کے سامنے درس دیتے وقت کاغذ کے پرزے پر اپنی حاجت پیش کرتے تھے اور ان کے تکمیل مقاصد کی دعا کے لیے درخواست کرتے تھے اور تلامذہ ان کے ساتھ آمین کہتے تھے۔

مقریؔ نے اپنی مشہور تصنیف "نفح الطیب" میں متعدد قصے علماء اندلس کے بیان کیے جن سے پتہ چلتا ہے کہ بیانِ حق اور اظہارِ صدق میں اندلس کے علماء بھی مشرق کے علماء کی طرح نہایت نڈر تھے، اس سلسلہ میں اختصار کے لحاظ سے صرف ایک مشہور عالم و فاضل قاضی منذر ابن سعید کے چند واقعات جو ان کے اور خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کے ساتھ گزرے، بیان کیے جائیں گے۔

خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کے دربار کی شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ مشہور عالم ابو علی القالی صاحب "امالی" جن کو لوگ "امیر الکلام" اور "بحر اللغت" کے لقب سے یاد کرتے تھے، جب اس کے دربار میں پہنچے تو اس قدر ششدر ہوئے کہ منہ سے آواز تک نہ نکل سکی۔

خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کو شہر آباد کرنے اور ان میں خوب صورت عمارتوں کے بنانے کا بے حد شوق تھا۔ جب عبدالرحمٰن نے مشہور خوب صورت شہر "الزہرا" کی بنیاد رکھی تو اپنی تمام ہمت اس شہر کو خوب صورت بنانے میں صرف کر دی اور اس قدر منہمک ہوئے کہ تین جمعہ تک جامع مسجد نماز ادا کرنے نہیں گئے، چوتھے جمعہ کو جب نماز جمعہ کے لیے آئے تو قاضی منذر نے اپنا خطبہ کلام مجید کی آیت ﴿أتبنون بكل ريع﴾ سے شروع کر کے "واعظین" تک پڑھا اور اس کے بعد کلام مجید کی آیت ﴿متاع الدنيا قليل والآخرة لمن اتقى﴾ پڑھی اور دوران تقریر میں نہایت پر زور الفاظ میں عمارات میں اسراف اور خوب صورت عمارات کی بناء کی مذمت بیان کی، تخویفِ موت اور اس کی تکالیف کو یاد دلاتے ہوئے نفس کو اس کی خواہشات کے مطابق چھوڑ دینے کے عیوب بیان کیے، اس تقریر سے جملہ حاضرین پر بہت اثر ہوا، خصوصاً خلیفہ پر کیونکہ اُنھوں نے محسوس کیا کہ روئے سخن اس کی ذات کی طرف ہے، خلیفہ بہت رُوئے اور اپنے گناہوں سے توبہ کی، خلیفہ جب کبیدہ خاطر محل میں واپس آئے تو اپنے بیٹے الحکم سے کہا کہ قاضی نے آج اتنے بڑے مجمع میں مجھے ذلیل کیا اور مجھ کو نصیحت کرنے میں سیاستِ ملک کا بھی خیال نہ کیا، اب میں ان کے پیچھے نماز جمعہ کبھی نہ پڑھوں گا، چنانچہ خلیفہ نے دوسری مسجدوں میں نماز پڑھنی شروع کی، ایک دن الحکم نے خلیفہ سے کہا کہ کیا مشکل ہے آپ قاضی کو معزول کر دیجئے اور ان کی جگہ دوسرا امام مقرر کر دیجیے، یہ سن کر خلیفہ کو بے حد غصہ آیا اور کہنے لگے "منذر ایسے آدمی کو اس عہدہ پر قائم رکھنا ضروری ہے، خواہ تم کو ولی عہدی سے معزول کیوں نہ کرنا پڑے، تاکہ تمھارے

© rasailojaraid.com

نفس کو جو راہ راست سے دور ہو کر غیر مقصود کی طرف جاتا ہے سزا ملے، مجھے خود افسوس ہے کہ میرے اور نماز جمعہ کے درمیان منذر جیسا باورع آدمی شفیع نہ ہو، اب میں منذر ہی کے پیچھے نماز پڑھوں گا" چنانچہ الحکم نے خلیفہ سے معذرت کی اور کہا کہ قاضی صاحب کا صرف عمارات پر اعتراض بلاشک ان کی نیک نیتی پر مبنی ہے۔

اسی طرح ایک روز عبدالرحمٰن الناصر اپنے وزراء اور اہل خدمت کے ساتھ اس چھت کے نیچے بیٹھے تھے جس کے قبہ میں سونے اور چاندی کی اینٹیں لگی تھیں اور اس پر آنکھ آسانی سے ٹھہر نہیں سکتی تھی، عبدالرحمٰن الناصر اس چھت کی خوب صورتی اور صناعی کے متعلق ان لوگوں سے فخریہ کہنے لگا کہ "مجھ سے پہلے کسی بادشاہ نے ایسا قبہ بنوایا ہے؟" سب نے کہا کہ "تعمیر کے باب میں کوئی بادشاہ خلیفہ سے سبقت نہیں لے گیا" اتفاق سے قاضی منذر بھی وہاں آگئے، خلیفہ نے یہی سوال قاضی صاحب سے کیا، قاضی صاحب کے آنسو بہنے لگے اور جب کچھ سکون ہوا تو فرمانے لگے "اے امیر المؤمنین یہ خیال مجھ کو نہ تھا کہ شیطان آپ کو یہاں تک پہنچادے گا، آپ کو خدا نے فضل و نعمت عطا فرمائی اور آپ کو اہل دنیا پر فضیلت دی، آپ کافروں کی منزل تک پہنچ گئے" یہ سن کر خلیفہ شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے "آپ کو کچھ خیال ہے کہ آپ مجھ کو کیا کہہ رہے ہیں آپ مجھ کو منزل کفار تک پہنچا رہے ہیں" قاضی صاحب نے فرمایا جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، حقیقت ہے اور آپ نے یہ آیت تلاوت کی "لولا ان یکون النّاس امة واحدة لجعلنا لمن یکفربالرحمن لبیوتھم سُقفا من فضة ومعارج علیھا یظھرون"۔ خلیفہ یہ سن کر بہت شرمندہ ہوئے اور فرمانے لگے "خداوند تعالیٰ آپ کو جزائے نیک دے اور آپ جیسے لوگوں کی ہم لوگوں میں کثرت ہو، جو آپ نے فرمایا حق ہے" مجلس سے فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور حکم دیا کہ قبہ کی چھت سے سونے چاندی کی اینٹیں اُکھاڑ دی جائیں۔

قاضی صاحب عبدالرحمٰن الناصر کے ساتھ بناء عمارات میں نہایت سختی سے پیش آتے تھے، ایک مرتبہ قاضی منذر، عبدالرحمٰن الناصر کے پاس گئے یہاں رئیس عثمان بن ادریس، "زہرا" کی تعریف میں ایک قصیدہ سنا رہے تھے، قاضی صاحب تھوڑی دیر تک سنتے رہے اور پھر کھڑے ہو کر یہ اشعار پڑھنے لگے

یا بانی الزھراء مستغرقاً اوقاته، فیھا اما تمھل

لِلّٰه ما أحسنھا رونقاً لو لم تکن زھرتھا تذبل

(اے بانی زہرا تو اپنی اوقات کو اس میں مستغرق رکھتا ہے کیا تو ٹھہر نہیں جاتا۔)

(واللہ کیا خوب اس کی رونق ہے اگر اس کی خوب صورتی کھنڈر نہ ہو جائے۔)

خلیفہ نے فرمایا انشاء اللہ ایسا نہ ہوگا، قاضی صاحب نے جواب دیا کہ "اے خدا تو گواہ ہے کہ میں نے نصیحت میں کمی نہیں کی" بالآخر دوران فتنہ میں "زہرا" کھنڈر ہو ہی گیا۔

ابن الجوزی کا بیان ہے کہ خراسان میں ایک طالب علم جو تیس برس سے ایسا بہرہ ہو گیا تھا کہ گدھے کی بھی آواز نہ سن سکتا تھا، جب مسجد میں درس دینے جاتا تو لوگ کندھے پر بٹھا کر مسجد پہنچاتے، علماء کو لوگ پہلے سلام کرتے تھے اور اگر علماء سواری پر نکلتے تھے تو لوگ ان کے ساتھ ساتھ چلتے تھے، علماء کی موت پر غسل میت ان کے خاص شاگرد دیتے تھے اور کبھی کبھی تمام شہر کے لوگ جنازے میں شریک ہوتے تھے، حضرت حسن بصری کے جنازے میں جمعہ کے دن بصرہ کے تمام لوگ شریک ہوئے یہاں تک کہ جمعہ کی نماز کی شرکت کے لیے اور نماز پڑھانے کے لیے کوئی نہیں رہا، یہ واقعہ اسلامی تاریخ میں اپنی نوعیت کا خاص واقعہ خیال کیا جاتا ہے، اسی طرح جب مشہور امام الحرمین (۴۴۲ھ سنہ ۱۰۵۰ء) نے نیشاپور میں وفات پائی تو عام ماتم منایا گیا، شعراء نے مرثیے لکھے، سوداگروں نے اپنی دوکانیں بند کر دیں، منبر توڑ دیا گیا اور شاگردوں نے قلم و دوات توڑ دیئے، اسی طرح جوینی کی موت پر ان کا منبر توڑ دیا گیا، پورے نیشاپور میں ان کا ماتم کیا گیا، شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے اور ٹوپی کے بجائے لوگوں نے سر پر رومال باندھ لیے، اسی طرح امام احمد بن حنبل کے جنازے میں ۸ لاکھ مرد ۶۰ ہزار عورتیں شریک ہوئیں۔ (جاری ہے) ☆☆☆

© rasailojaraid.com